خواجہ احمد عباس

"......... میں اپنے خون کے رشتے داروں ہی کی اولاد نہیں ہوں۔ میں اپنے ملک اور قوم کی اولاد بھی ہوں۔ گاندھی اور نہرو کے خاندان میں سے ہوں اور انسانیت اور سوشلزم کے ناطے سے میرے رشتے دار ساری دنیا میں ــــ روس میں اور امریکہ، انگلستان میں اور چین میں ــــ پھیلے ہوئے ہیں اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ مجھ پر اثر انداز ہوتا ہے ــــ ...."

میرے بچپن میں سب سے پہلی اور سب سے اہم شخصیت جس نے مجھے متاثر کیا وہ میرے نانا خواجہ سجاد حسین مرحوم تھے۔ وہ ہمارے خاندان ہی میں نہیں ہمارے قصبے میں سب سے نمایاں ہستی تھے۔ میرے بچپن کی اوّلیں یادیں ان کی شخصیت سے وابستہ ہیں۔ گیارہ برس ہوئے لگ بھگ اسّی برس کی عمر میں اُنہوں نے وفات پائی لیکن بچپن ہی سے ہم سب بھائی بہن اُن کو بہت بوڑھا سمجھتے تھے۔ حالانکہ اس وقت ان کی عمر پچاس پچپن ہی کی تھی اور ان کی مختصر ڈاڑھی پوری طرح سے سفید نہیں ہوئی تھی اور ان کے گورے چہرے پر جھرّیوں کا بھی کوئی نشان نہ تھا لیکن پھر بھی ہمارے ذہن میں ان کی شخصیت الف لیلہ کے کسی دراز ریش بزرگ کی سی تھی جو اپنی عقل اور دُور اندیشی سے انسانی زندگی کے اُلجھے ہوئے مسئلوں کو سلجھاتا ہے اور خواجہ خضر کی طرح ظلمات کے اندھیرے میں سندباد جہازی کو راستہ بتاتا ہے۔ دراصل ہم بچپن میں خدا کی ہستی کو بھی اپنے نانا کی نورانی صورت اور بزرگانہ شان ہی میں تصوّر کرتے تھے۔ سُنا تھا کہ خُدا ساری کائنات میں بزرگ و برتر ہے۔ سو ہمارے نانا (جنھیں ہم بابا کہا کرتے تھے) بھی ہمارے قصبے کی سب سے بزرگ اور قابلِ احترام ہستی تھے جن کا حکم ہر کوئی مانتا تھا۔ سُنا تھا کہ خدا نیکی سے خوش ہو کر انعام دیتا ہے اور بدی سے ناراض ہو کر سزا دیتا ہے۔ بس یہی خصوصیت ہمارے بابا کی تھی۔ وقت پر نماز پڑھنے اور قرآن کا سبق یاد کرنے پر ہمیں ان کے دربار سے دو پیسے ملتے تھے (اور اس زمانے میں دو پیسے کتنی بڑی دولت ہوتے تھے اس کا تو آج اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا) اور جھوٹ بولنے یا گالی بکنے پر اُن کے ہاتھ سے ہمارے گالوں پر دو زنّاٹے دار چپت پڑتے تھے۔ جزا اور سزا کا مسئلہ ہمارے لیے بالکل ہی مبہم اور پیچیدار نہیں تھا۔

جب میں چار پانچ برس کی عمر میں گھر کی چار دیواری سے اسکول کی دنیا میں آیا، اُس وقت مجھ پر اپنے بابا کی شخصیت کے دوسرے اہم پہلو روشن ہوئے۔ یہ اسکول ہمارے پڑنانا خواجہ الطاف حسین حالی کے نام پر حالی مسلم ہائی اسکول کہلاتا تھا اور خواجہ سجاد حسین اس کے بانی، سکریٹری اور کرتا دھرتا تھے۔ دراصل ان کی زندگی تمام تر اس اسکول کے لئے وقف تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اپنے ہم قوموں میں نئی تعلیم رائج کرنے کے لئے انھوں نے کتنی بڑی قربانیاں کی تھیں۔ آج سے ساٹھ برس پہلے وہ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کے پڑھے ہوئے پہلے چار مسلمان نوجوانوں میں تھے جنہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بی۔ اے کی سند دولت و اقتدار کی سنہری کُنجی سمجھی جاتی تھی۔ یوپی کے گورنر نے چار مسلمان نوجوانوں کو بلا کر کہا کہ گورنمنٹ سروس کے کسی اعلیٰ عہدے کے لئے بھی وہ درخواست دے سکتے ہیں۔ اُنھیں صرف یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ کس محکمے میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ سول سروس، فوج، پولیس، جوڈیشری یا تعلیم۔ ایک نے سول سروس کو چنا اور دس برس میں کمشنر کے درجے تک پہنچ گیا جو اس زمانے میں ہندستانی سویلین کی معراج تھی۔ دوسرے نے پولیس کا محکمہ چُنا اور انسپکٹر جنرل کے عہدے تک ترقی کی۔ تیسرا جوڈیشری میں گیا اور سیشن جج ہو کر ریٹائر ہُوا۔ لیکن سجاد حسین نے وہ محکمہ پسند کیا جو سرکاری ملازمتوں میں اُن دنوں سب سے گھٹیا سمجھا جاتا تھا یعنی تعلیم۔ ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر سے انسپکٹر جنرل مقرر ہوئے تھے کہ نوکری سے استعفیٰ دے کر چوتھائی تنخواہ پر پنشن لے لی۔ اور چالیس پچاس روپے سے اپنے قصبے میں اسکول چلانے لگے۔

اور اس کے بعد نہ صرف اپنی ساری پنشن بلکہ اپنی ساری باقی عمر اور اپنا تمام وقت اور تمام ہمت اور صحت اس اسکول کے چلانے بڑھانے اور ترقی دینے میں صرف کر دی۔ ۱۹۲۶ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو میں اُن کے بسترِ مرگ کے قریب ہی تھا۔ موت سے صرف ایک گھنٹہ پہلے انہوں نے انتہائی کمزوری اور بے ہوشی کے عالم میں ایک لمحے کے لئے آنکھ کھولی اور ہونٹوں کی خفیف سی جنبش سے پوچھا: "میٹرک کا نتیجہ کب نکلے گا؟" آخری دم میں بھی ان کو اسکول ہی کی فکر تھی۔

اپنے نانا کے بعد جس ہستی سے میں اثر پذیر ہوا وہ میرے والد خواجہ غلام السیدین کی تھی۔ اگر بابا کی زندگی ایثار اور خدمتِ قوم کا ایک روشن نمونہ تھی تو آبا (جیسا ہم اپنے والد کو کہتے تھے) کے کردار سے میں نے بچپن ہی میں انسان دوستی اور جمہوریت پسندی کے ان اصولوں کو سیکھا اور سیکھا جو آخر مجھے اشتراکیت کی سرحد تک لے آئے۔ جس خاندان اور جس ماحول میں میں پیدا ہوا تھا اُس میں چھوٹی موٹی زمینداری کی بنیادوں پر کتنی ہی جھوٹی قدروں کے کھنڈر ڈگمگا رہے تھے۔ حسب نسب۔ شرافت رذالت۔ اونچے خاندان۔ نیچ خاندان۔ سیّد۔ انصاری۔ شیخ۔ برہمن مغل اور پٹھان کے امتیازات۔ شادی بیاہ کے رسم میں فضول خرچیاں۔ قبر پرستی، توہم پرستی۔ تعویذ گنڈے۔ پیری مُریدی۔ نذر نیاز۔ عرس اور قوالیاں۔ مجلسیں اور ماتم، اگر میں شروع ہی سے ان اقدار کے غلط اثرات سے محروم یا محفوظ رہا تو اس کی صرف ایک وجہ تھی کہ میرے والد ایک ایسے اسلام کے پیرو تھے۔ جس میں توہمات اور تعصبات دونوں کے لئے جگہ نہیں تھی اور جس کی بنیاد عقل اور انسان دوستی پر تھی۔ پانچ برس کی عمر میں میں نے جمہوریت کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ نہ انسانی برابری کا مسئلہ کسی نے مجھے سمجھایا تھا۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ایک بار گھر کے ملازم چھوکرے کو (جو میرا ہی ہم عمر تھا) "ابے" کہا تھا۔ کہنے کی یہ سزا ملی تھی کہ بارہ گھنٹے تک اندھیرے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ نہ کھانا نہ پانی۔ جب تک ہاتھ جوڑ کر اُس ملازم سے معافی نہیں مانگی۔ آبا کٹّر حد تک سادگی پسند (PURITAN) تھے۔ نہ انھیں انگریزی فیشن اچھے لگتے تھے اور نہ وہ ہندوستانی ٹیپ ٹاپ کو ہی پسند کرتے تھے۔ نہ وہ اپنی بیٹیوں کو زیور گہنے بنوا کر دیتے تھے۔ نہ بیٹے کو انگریزی بال رکھنے دیتے تھے۔ عرس میں جا کر قوّالی سُننے کو بھی بُرا سمجھتے تھے اور سنیما کے ناچ گانوں کو بھی۔ نہ ہمیں پان کھانے کی اجازت تھی نہ چائے پینے کی۔ اُن کی خواہش اور کوشش تھی کہ اُن کی اولاد سادہ اور جفاکش زندگی کی عادی ہو۔ توہمات اور غیر ضروری رسمات سے آزاد ہو اور تعلیم اور صحت کی طرف پُوری توجہ دے۔ اپنے عقیدے میں وہ بہت سخت گیر تھے۔ مگر ان کے مزاج میں ایک عجیب شگفتگی اور مزاح کی چاشنی تھی جو ان کی اصول پرستی کو کٹھ ملاؤں کی سی، دکھی پند و نصیحت سے بچائے رکھتی تھی۔ کسی کو پان سے ہونٹ رچائے ہوئے دیکھتے تو سنجیدہ چہرہ بنا کر پوچھتے۔ "خیریت تو ہے؟ کیا چوٹ لگ گئی ہے کہ منہ سے خون جاری ہے؟" چائے کو بھنگ کہتے تھے لیکن کوئی چائے کا شوقین دوست ملنے آجاتا تو کہتے۔ "ارے اندر جا کر کہو ایک بھنگڑ آیا ہے۔ اس کے لئے تھوڑی سی بھنگ گھول کر بھیج دیں۔"

آبا جتنے اپنے عقیدوں میں پکے تھے۔ اتنی ہی حد تک آزادیِ رائے کے حامی بھی تھے۔ آخر عمر میں وہ مسلم کانفرنس میں شامل ہوگئے (جو مسلم لیگ کی طرح فرقہ وارانہ جماعت تھی) اور میں اس وقت تک کانگریس کو بھی پیچھے چھوڑ کر سوشلزم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن کبھی انہوں نے اپنے اصول مجھ پر زبردستی عائد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سیاسی بحث ضرور کرتے۔ گرماگرمی بھی کبھی کبھی ہو جاتی۔ لیکن جیسی برابر کے دوستوں میں ہوتی ہے۔ اُن کے کئی دوستوں نے بار بار انھیں سمجھایا کہ اپنے بیٹے کو انقلابی تحریکوں کا ساتھ دینے سے روکیں لیکن ایک بار بھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ کانگریس یا سوشلسٹ پارٹی کا ساتھ چھوڑ دو۔ دراصل وہ اس بات سے بہت خوش تھے کہ ان کا بیٹا اپنے اصولوں

پر قائم رہنے کی ہمت رکھتا ہے (خواہ اُن اصولوں کو وہ کتنا ہی غلط سمجھتے ہوں)

ماں باپ اپنی اولاد کے لئے نقد، مکان، جائداد، زمین ورثے میں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہمارے ابا نے ان میں سے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ مرنے سے چند روز پہلے مجھے ایک فہرست دی اُن رشتے داروں، دوستوں اور جاننے والوں کی جن کو انھوں نے مختلف رقمیں قرض دی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ کوئی ہنڈیاں، پرچے یا رسیدیں ہیں کیا۔ جواب میں انھوں نے سر ہلا کر نہیں کہہ دیا۔ پھر مجھے ہدایت کی کہ ان میں سے کسی پر کبھی قرض کی ادائیگی کا تقاضا نہ کرنا۔ ان لوگوں کے پاس ہوگا تو وہ خود واپس کر دیں گے۔ ساری رقمیں ملا کر پینتیس ہزار کے لگ بھگ تھیں۔ ایک ہزار روپے بھی واپس نہیں ملے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اب پاکستان چلے گئے ہیں اور مدت ہوئی۔ میں نے وہ فہرست بھی پھاڑ دی ہے۔ ابا جو "جائداد" ہمارے لئے چھوڑ گئے وہ دوسری ہی قسم کی تھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ بظاہر اُن میں اور مجھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نظر نہیں آتی۔ ان کے چہرے پر داڑھی تھی، میں روزانہ شیو کرتا ہوں۔ وہ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ میں قمیص اور پتلون پہنتا تھا۔ وہ مسلم کانفرنس کی فرقہ وارانہ سیاست کو سراہتے تھے۔ میں کانگریس کے دائیں بازو کو بھی رجعت پسند قرار دیتا ہوں اور کوشاں ہوں کہ ہمارا ملک جتنی جلدی ہو، سوشلزم کی منزل تک پہنچ جائے۔ وہ کبھی فلم نہیں دیکھتے تھے۔ میں فلم بناتا ہوں۔ وہ عورتوں کو پردہ کرانے کے حامی تھے اور میں اس کا مخالف ہوں۔ ان تمام باتوں کے باوجود لوگ کہتے ہیں کہ ان کو میری شخصیت اور میرے کردار میں میرے والد کی جھلک نظر آتی ہے۔ کوئی کہتا ہے میں بھی ان کی طرح ضدی ہوں۔ کوئی کہتا ہے وہ بھی میری طرح "غیر مقلد" (NON CONFORMIST) تھے۔ کسی کی رائے ہے کہ میں بھی ان کی طرح روپے پیسے کی طرف سے لاپرواہ ہوں اور کوئی کہتا ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں خودسر اور خودرائے ہیں اور شاید وہ غلط نہیں کہتے۔ میرے عقائد اور خیالات میری نسل اور میرے زمانہ کی پیداوار ہیں۔ لیکن جن اثرات نے میرے بنیادی کردار کی تشکیل کی ہے۔ ان میں (ہر معمولی انسان کی طرح) میرے والد اور والدہ کی شخصیات سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہیں۔

میرے ابا اور میری اماں کے کرداروں کا تضاد نہ صرف دلچسپ بلکہ معنی خیز تھا۔ جن چیزوں کو ابا ناپسند کرتے تھے (جیسے پان، چائے، سرمہ، کاجل، مسّی، چوڑیاں، زیور، بچوں کے لئے ریشمی کپڑے) ان سب کو اماں پسند کرتی تھیں۔ ابا کا اصرار تھا کہ ان کے بچے کھدر کے سادہ کپڑے پہنیں، مگر اماں آنکھ بچا کر ہمیں ململ کے کرتے، ساٹن کے پاجامے اور عید پر ریشمی شیروانیاں بنوا کر دیتی تھیں۔ ابا کبھی ہمیں ڈانٹتے تو وہ ہمیں پچکار کر تسلی دیتیں۔ ایک طرف سے سختی اور دوسری طرف سے نرمی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہم بچوں کی زندگی میں آپ سے آپ ایک قسم کا توازن آ گیا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے اپنے بچوں کی تربیت کے لئے یہ پروگرام بنایا تھا۔

یہ تو ہمیں بچپن ہی سے معلوم تھا کہ ہماری اماں بھی (ہر ماں کی طرح) اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتی ہیں اور وقتاً فوقتاً ہم اس کا جائز اور ناجائز فائدہ بھی اٹھایا کرتے تھے۔ لیکن ان کی زندگی کے صرف آخری دنوں میں مجھے اپنی اماں کے کیرکٹر کی مضبوطی، ان کی انسان دوستی اور رواداری کا پورا احساس ہوا۔

جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوا اُس وقت (والد کا انتقال ہو چکا تھا) میری اماں اور بہنیں پانی پت میں تھیں اور

میں بمبئی میں جب مغربی پنجاب کے زخم خوردہ ہندو سکھ شرنارتھیوں کے بعد پانی پت میں مسلمانوں کا رہنا مشکل ہوگیا اور وہ سب پاکستان "ہجرت" کی تیاری کرنے لگے تو میری ماں پر بھی دوسرے عزیز رشتے داروں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ ان کے ساتھ پاکستان چلیں اور مجھے بھی لکھیں کہ میں بمبئی سے کراچی آجاؤں۔ مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ "ہم اپنا وطن نہیں چھوڑیں گے۔ میرے بیٹے نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے میں میں اس کے ساتھ ہوں۔"

فسادات کے بیس بائیس دن انھوں نے پانی پت میں گزارے۔ سات سات دن کا کرفیو لگتا۔ گھر میں چٹنی روٹی کھا کر گزارہ کرنا پڑتا۔ اور پان جو ان کی زندگی کا اہم جزو تھا۔ روپے میں ایک پتہ نصیب ہوتا جس کے دس چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے وہ دن بھر گزارہ کرتیں۔ پھر ایک ملٹری ٹرک ان سب کو نکالنے کے لئے دہلی سے پانی پت بھیجا گیا اور راتوں رات برقع پوش عورتوں کو اپنا وطن اور اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ بیس دن وہ سب دہلی میں رہے۔ تیس آدمی ایک کمرے میں بند۔ اور اس عرصے میں خبر آئی کہ پانی پت میں ہمارے مکان لُٹ گئے اور شرنارتھیوں نے اُن پر قبضہ کر لیا ہے۔

ان حالات میں وہ ہوائی جہاز سے بمبئی آئیں۔ زندگی میں پہلی بار جان بچانے کے لئے برقع ترک کرنا پڑا۔ میں ڈر رہا تھا کہ ان سب باتوں کا اثر ان کے مزاج پر نہ جانے کیسا پڑا ہوگا۔ مگر پہلے الفاظ جو ایئر پورٹ پر میں نے ان سے سُنے وہ یہ تھے۔ "بھئی میں تو اب ہمیشہ ہوائی جہاز میں سفر کیا کروں گی۔ بڑے آرام کی سواری ہے۔"

اور اس رات پانی پت اور دہلی کے حالات سناتے ہوئے انھوں نے کہا: "نہ یہ اچھے، نہ وہ اچھے، نہ مسلمانوں نے کسر اٹھا رکھی ہے، نہ ہندوؤں اور سکھوں نے سب کے سروں پر خون سوار ہے۔ مگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں تو مسلمانوں کو زیادہ الزام دوں گی کہ انھوں نے اپنی حرکتوں سے اسلام کا نام ڈبو دیا۔"

میرا ایک پنجابی شرنارتھی ہندو دوست ان دنوں میرے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ سن کر کہ اُس کے شہر شیخوپورہ میں بہت سے ہندو مارے گئے ہیں اور میرے دوست کے گھر والے راتوں رات وہاں سے پیدل چل کر ہندوستان کے کسی شرنارتھی کیمپ میں پہنچے۔ میری ماں بہت دیر تک روتی رہیں اور پھر مجھے الگ لے جا کر کہا۔ "دیکھنا یہ لڑکا آج سے تمہارا بھائی ہے اس کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ شاید اس طرح سے ہم ان گناہوں کا کفارہ ادا کر سکیں جو ہمارے ہم مذہبوں نے کئے ہیں۔" رواداری اور انسان دوستی کی قدریں میں نے کسی کتاب سے نہیں حاصل کیں، اپنی ماں کی شخصیت سے ورثے میں پائی ہیں۔

شخصیات جنہوں نے مجھے متاثر کیا؟ یہ فہرست تو لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ کس کس کا نام گناؤں؟ اپنے رشتے داروں میں ایک اور ہستی کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ وہ ہیں میرے چچا زاد بھائی خواجہ غلام السیدین جو آج گورنمنٹ آف انڈیا کی ایجوکیشنل منسٹری کے سکریٹری ہیں لیکن میں بچپن سے آج تک انھیں "بھائی جان" ہی کہتا آیا ہوں۔ میرے خیال میں بچپن میں ہر کسی کا ایک IDEAL ہوتا ہے۔ اور عام طور سے وہ اس کا بڑا بھائی ہوتا ہے جس کو دیکھ کر بچہ اس کی نقل کرنا چاہتا ہے جیسے کیو "بس اگلے آدمی کی نقل و حرکت کی ہم پیروی کرتے ہیں اس طرح بچپن میں لاشعوری طور پر چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے۔ میرا اپنا کوئی سگا بھائی نہیں تھا اس لئے بچپن سے ہی اپنے چچا زاد بھائیوں ہی کو میں سگا بھائی سمجھتا تھا۔ بھائی جان مجھ سے دس برس بڑے ہیں۔ جب میں پانی پت

کے پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا تو وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ چھٹیوں میں جب وہ آتے تو ان کی موٹی موٹی انگریزی کی کتابوں اور ٹینس کے ریکٹ کا مجھ پر بڑا رعب پڑتا۔ وہ اپنے یونیورسٹی میگزین کے لئے کبھی بیٹھ کر کوئی مضمون لکھتے تو میرا بھی جی چاہتا کہ میرے قلم میں بھی کسی دن ایسی طاقت آجائے کہ میں یوں بے تکان مضمون لکھ سکوں۔ اور پھر وہ انگلستان پڑھنے گئے اور وہاں سے اُن کے خط اور تصویر والے پوسٹ کارڈ آنے لگے تو ہمارے لئے اور بھی دلچسپی اور حیرت اور رشک کا سامان ہو گیا۔ لندن۔ لیڈز۔ کیمبرج۔ آکسفورڈ۔ پیرس۔ برلن۔ جنیوا۔ ہم اپنے اسکول کے اٹلس میں ان شہروں کو ڈھونڈنے لگے اور وہاں سے آئی ہوئی تصویروں کو سنبھال کر البم میں لگانے لگے اور دل ہی دل میں سوچتے۔ کیا کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ ہم بھی اس وسیع اور رنگین دنیا کی سیر کر سکیں گے اور پھر ولایت سے واپس آگئے۔ فرسٹ کلاس ڈگری لے کر اور علی گڑھ میں پروفیسر ہو گئے۔ اس سال علی گڑھ یونیورسٹی کی جوبلی تھی۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے۔ اپنے نانا کے ساتھ میں بھی اصرار کر کے علی گڑھ پہنچا۔ یونیورسٹی کی شاندار عمارتوں اور جوبلی کے ہنگاموں کا رعب تو پڑا ہی۔ لیکن سب سے زیادہ رعب پڑا اس ڈبیٹ کا جو جوبلی پنڈال میں ہوئی اور جس کے ہیرو ہمارے بھائی جان قرار پائے۔ اگر میں کسی ایک واقعہ کو یاد کروں جس نے میری زندگی پر سب سے گہرا اثر ڈالا ہے تو وہ یہی ڈبیٹ ہوگی۔

کوئی پانچ چھ ہزار کا مجمع ہوگا۔ اسٹیج پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سب ہی مشہور سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر موجود تھے۔ مسٹر محمد علی جناح۔ سر آغا خان۔ سر محمد اقبال۔ سر علی امام۔ ڈبیٹ کا مضمون تھا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی سیاست میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کام کرنا چاہیئے۔ اپنی سیاسی تنظیم علیحدہ نہیں کرنی چاہیئے۔" یہ تجویز ہمارے بھائی جان نے پیش کی اور اس کی مخالفت کی۔ اُن تمام مشاہیر و قائدین نے جو وہاں موجود تھے۔ میں تو اس وقت انگریزی نہیں کے برابر سمجھتا تھا۔ لیکن یہ میں دیکھ سکتا تھا کہ بھائی جان نے تقریر کی تھی اسٹیج کی دائیں طرف سے اور سب بڑے لوگ بول رہے تھے اُن کی مخالفت میں۔ جب اُن سب کی تقریریں ختم ہو گئیں تو تجویز پیش کرنے والے نوجوان کو جواب الجواب دینے کا حق دیا گیا۔ اس وقت بھائی جان نے وہ تقریر کی جو علی گڑھ کی تاریخ میں آج تک یادگار ہے اور جس نے میری زندگی کا رخ موڑ دیا۔ انگریزی الفاظ نہ سمجھنے پر بھی میں اُن کے زورِ کلام کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ کتنی روانی تھی ان کی تقریر میں، کتنا سلجھا ہوا اور مدلل تھا ان کا انداز، کیسا جادو تھا ان کی آواز میں کہ ہر شخص مسحور اور مبہوت بنا ہوا ہمہ تن گوش سن رہا تھا۔ کتنا خلوص اور کتنا جوش تھا اُن کے بیان میں کہ جب اُن کی تقریر ختم ہوئی تو سارا پنڈال تالیوں سے گونج اُٹھا اور مسٹر علی امام جنہوں نے تجویز کی مخالفت کی تھی اُٹھے اور اپنے نوجوان حریف کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد جب حاضرین کی رائے لی گئی تو کثرت رائے سے تجویز پاس ہو گئی اور میرے دھڑکتے ہوئے دل نے مجھ سے کہا۔ "کتنے قابل ہیں میرے بھائی جان، کتنی اچھی تقریر کی اُنھوں نے، ایک دن میں بھی اُن جیسا بنوں گا۔ اُن جیسی تقریر میں کروں گا۔ مگر اس کے لئے بہت کچھ پڑھنا پڑے گا، لکھنے اور بولنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ بڑے آدمیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا...... مگر میں سب کچھ کروں گا۔ سب کچھ کروں گا۔

اور میں جو کبھی انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا، پھر ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، پھر جج، پھر ڈپٹی کلکٹر، اب صحافی اور مقرر اور سیاست دان بننے کے خواب دیکھنے لگا۔

ان کے علاوہ وہ شخصیتیں بھی ہیں جن سے میں ہی نہیں میری نسل کے کروڑوں ہندوستانی متاثر ہوئے ہیں اور جن کی چھاپ

ہم سب کی زندگی اور کردار پر موجود ہے۔

مہاتما گاندھی: ان کو پہلی بار جب میں نے دیکھا تھا اس وقت میری عمر صرف پانچ یا چھ برس کی تھی لیکن اس وقت بھی ان کی مقناطیسی شخصیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔

بھگت سنگھ، جس کی شہادت کے دن میں اور میرے بہت سے کالج کے ساتھی اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے جیسے ہمارا سگا بھائی پھانسی پر چڑھا دیا گیا ہو۔

جواہر لال نہرو، جن کو کالج کے دنوں میں ہم نوجوانوں کا لیڈر سمجھتے تھے اور جن کی انقلابی اور اشتراکی تقریروں اور تحریروں کا ایک ایک لفظ ہمیں حفظ یاد ہوتا تھا۔

منشی پریم چند، جن کی کتابوں سے میں نے سیکھا کہ ادب میں صرف رومان اور فرار ہی نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی کی سچی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

پورن چند جوشی، جن سے مل کر مجھے معلوم ہوا کہ کمیونسٹ مارکسی اصولوں کو دہرانے والی مشینیں ہی نہیں ہوتے انسان اور انسان دوست بھی ہوتے ہیں۔

زندگی کی مختلف منزلوں اور موڑوں پر میں ان سب ہی سے تو متاثر ہوا ہوں۔

اور واقعات؟

پہلا ناقابلِ فراموش واقعہ ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے۔ جب میں صرف چار یا پانچ برس کا تھا اور پانی پت میں پرائمری اسکول کی پہلی جماعت میں پڑھتا تھا۔ جلیانوالہ باغ کا خونی ڈرامہ کھیلا جا چکا تھا اور تمام پنجاب کی آبادی کو اطاعت اور وفاداری کا سبق پڑھایا جا رہا تھا۔ سڑک اعظم (جو دہلی سے پشاور جاتی ہے) کے کنارے جتنے شہر اور قصبے تھے ان کے تمام اسکولوں کو حکم ملا کہ اپنے بچوں کو سڑک کے کنارے قطاریں بنا کر کھڑا کریں۔ کیونکہ وہاں سے انگریزی گھوڑ سوار فوج کے رسالے گزرنے والے تھے۔ صبح سویرے سے سہ پہر تک ہم گرمیوں کی دھوپ میں وہاں کھڑے رہے۔ کئی بچوں کو لو لگ گئی۔ ایک بھوک اور دہشت سے بیہوش ہو گیا۔ تب جا کر انگریز فوجیوں کے لال لال چہروں کے درشن ہوئے۔ اس زمانے میں ایٹم بم اور راکٹ تو ایجاد نہیں ہوئے تھے لیکن انگریزی فوج کے پاس جتنے بھی بھیانک ہتھیار تھے وہ سب ہی تو اس جلوس میں ہمارے سامنے سے گزارے گئے۔ توپیں۔ مشین گنیں۔ رائفلیں۔ بندوقیں۔ پستول۔ بھالے۔ تلواریں۔ ہمارے دلوں پر برطانوی سامراج کی ہیبت بٹھانے کے لئے یہ جلوس تین گھنٹے تک سڑک اعظم سے گزرتا رہا اور ہم کھڑے دیکھتے رہے۔ لیکن جس مقصد سے یہ مظاہرہ کیا گیا تھا اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ بچوں کے دلوں میں اس فوج کے رعب یا خوف سے کہیں زیادہ نفرت بھری ہوئی تھی۔ شام کو جب ہم بھوک کے پیاسے نڈھال ہو کر گھر لوٹ رہے تھے تب بچے یا تو ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے۔ "ارے کیسے لال لال منہ کے انگریز تھے جیسے بندریاں بندر" اور یا تحریکِ خلافت اور نان کوآپریشن کے گیت گا رہے تھے جیسے:

" کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو "

اور اُس دن ایک چار یا پانچ برس کے بچے نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔ "میں ان انگریزوں کی سرکاری نوکری نہیں کروں گا "

اور اب چالیس برس بعد بھی جب انگریز سرکار ختم ہو چکی ہے اور آزاد ہندوستان کی اپنی قومی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ نہ جانے کیوں اب بھی میں سرکاری نوکری کے خیال سے گھبراتا ہوں۔

دوسرا ناقابلِ فراموش واقعہ ۔ شاید ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ نیا نیا سائیکل چلانے کا شوق ہوا تھا۔ چند دوستوں نے طے کیا کہ سائیکلوں پر آگرے جائیں گے جو علی گڑھ سے کوئی اسّی میل ہے۔ دھن تو تھی تاج محل کو چاندنی رات میں دیکھنے کی۔ لیکن راستے میں کسی کی سائیکل کا ٹیوب پھٹ گیا۔ اُسے ٹھیک کرنے کے لئے ایک گاؤں میں دوپہر بھر ٹھہرنا پڑا۔ اس گاؤں کی غربت کی تصویر آج تک میرے دل و دماغ پر نقش ہے۔ ٹوٹے پھوٹے کچے مکان۔ لوگوں کے پھٹے پرانے میلے کچیلے کپڑے۔ جھونپڑوں کے بیچ میں سے بہتا ہوا گندا نالہ جس پر کروڑوں مچھر بھن بھنا رہے تھے۔ دُبلے پتلے سوکھے جسم کے ننگے بچّے جو بھیک مانگنے کے لئے ہمارے سامنے ہاتھ پھیلا رہے تھے اور ہر چہرے پر نہ صرف افلاس بلکہ اس سے بھی زیادہ بھیانک ایک ٹیس یا یوسی کی چھاپ جیسے انھیں یقین ہو کہ ان کی حالت کبھی بہتر نہیں ہو سکتی۔ . . . . .

اس وقت تک میں نے سوشلزم پر دو چار کتابیں پڑھی تھیں لیکن اُس دن میں قطعی طور پر اشتراکیت پر ایمان لے آیا۔

۱۹۳۸ء میں میں نے دنیا کا سفر کیا۔ اس سفر نے میرے دماغ کو قوم پرستی کی حدود سے نکال کر بین الاقوامی اشتراکیت کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ امریکہ میں سرمایہ داری کی اتنی صنعتی ترقی کے باوجود بھی افلاس ہے اور انگلستان میں سامراجی روایات کے باوجود ترقی پسند اور اشتراکی حلقوں میں ہندوستان کے قوم پرستوں کے ساتھ ہمدردی ہے اور جرمنی اور اٹلی میں ہٹلر اور مسولینی ایک کروہ اور بھیانک فلسفے کی تعلیم دے رہے ہیں اور اسپین میں فاشزم اور جمہوریت کے درمیان آنے والی جنگ کا ریہرسل ہو رہا ہے . . . .

اسی سفر کے دوران میں میں نے نیویارک کے قریب ایک قصبے پوکیپ سی (POUGHKEEPSIE) میں تمام دُنیا کے نوجوانوں کی ایک کانفرنس میں شرکت کی جو فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرے کو روکنے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ آج کل تو تقریباً ہر سال ہی کہیں نہ کہیں نوجوانوں کے ایسے بین الاقوامی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال میں ماسکو میں تھا۔ جب وہاں لگ بھگ سو قوموں اور ملکوں سے آئے ہوئے چالیس ہزار نوجوان اکٹھے ہوئے لیکن ۱۹۳۶ء میں نوجوانوں کی بین الاقوامی تحریک کی ابتدا ہوئی تھی۔ ہماری کانفرنس میں صرف چھ سات سو نمائندے شریک ہوئے تھے جو شاید ۲۰۔۲۵ ملکوں سے آئے تھے لیکن پھر بھی کئی وجوہ سے اس کانفرنس کا گہرا نقش میری یاد پر آج تک موجود ہے۔ میرے (اور دوسرے نمایندوں کے لئے بھی) اتنے مختلف ملکوں کے نوجوانوں سے ملنے اور ان سے تبادلۂ خیالات کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ امریکن، انگریز، فرانسیسی، جرمن (جو ہٹلر کی خفیہ پولیس سے چھپ کر آئے تھے) اطالوی جو مسولینی کے چنگل سے کسی طرح چھٹ کر آئے تھے، میرے جیسے ہندوستانی نوجوان جو برطانوی سرکار سے مختلف بہانوں سے پاسپورٹ لے کر کسی نہ کسی طرح امریکہ پہنچ پائے تھے۔ چینی نوجوان جو جاپانی فاشزم کے خلاف اس وقت بھی برسرِ پیکار تھے۔ سیاسی اعتبار سے اس کانفرنس میں حیرت انگیز تنوع تھا۔ کہنے کو تو اس کے بارے میں بھی مخالفین نے کہا اور لکھا تھا کہ یہ کمیونسٹوں کا ڈھونگ ہے لیکن اس میں کمیونسٹ، سوشلسٹ، لبرل، قوم پرست اور یہاں تک کہ برطانیہ کی قدامت پرست CONSERVATIVE پارٹی کے وہ نوجوان اراکین شامل تھے جو ونسٹن چرچل کی پیروی میں فاشزم کے مخالف تھے۔ ہندوستان سے جو نمائندے گئے تھے۔ ان میں علاوہ اور نوجوانوں کے مرحوم یوسف علی مہر علی تھے۔ جو اس وقت بھی سوشلسٹ

پارٹی کے لیڈر تھے۔ موجودہ پارلیمنٹ کی کیمونسٹ ممبر رینو چکرورتی تھیں جو اس وقت انگلستان میں پڑھتی تھیں اور شاید اس وقت بھی کیمونسٹ پارٹی میں تھیں۔ اس کانفرنس کے مباحثوں کا ایک دلچسپ پہلو جو مجھے ابھی تک یاد ہے وہ یہ تھا کہ نمائندوں کی اکثریت کی رائے یہ تھی کہ فاشزم کے خلاف متحدہ محاذ کی خاطر کچھ عرصے کے لئے سامراج اور سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد کو ملتوی یا کم کر دینا چاہئے تاکہ امریکہ کے لبرل عقیدے کے سرمایہ داروں اور فرانس اور انگلستان کے ان سیاستدانوں کو بھی جو سوشلسٹ نہیں تھے۔ ہٹلر اور مسولینی کے خلاف جہاد میں شامل کیا جا سکے، لیکن ہم ہندوستانیوں کے لئے تو برطانوی سامراج اور جرمن فاشزم میں کوئی فرق نہیں تھا اور اگر کوئی فرق تھا بھی تو وہ یہی تھا کہ ایک بلا ہمارے گھر میں موجود تھی اور دوسری آفت کے بارے میں ہم نے صرف سُنا تھا۔ جب کانفرنس کا بنیادی رزولیوشن پیش ہوا تو اس میں سامراجی مقبوضات اور نوآبادیات کے لئے مکمل آزادی کے بجائے بتدریج جمہوری خود مختاری کا مطالبہ رکھا گیا تھا۔ بھلا اس سے ہم ہندستانی قوم پرستوں کی کہاں تسکین ہوتی۔

ہندوستان کی طرف سے مجھے اس تجویز پر بولنا تھا۔ میں نے برطانوی اور فرانسیسی سامراج کے خلاف اتنی شدومد سے تقریر کی اور اتنے زور شور سے ہندوستان اور ایسے دوسرے ملکوں کے لئے فوری مکمل آزادی کا مطالبہ کیا کہ برطانیہ اور فرانس کے غیر سوشلسٹ نمائندوں نے تو کانفرنس کا بائیکاٹ کرنے کی ٹھان لی۔ لیکن تقریر کے ختم پر باقی نمائندوں نے خوب زور سے تالیاں بجائیں اور پلیٹ فارم سے نیچے اُترتے ہی مجھے کئی ملکوں کے نوجوانوں نے گھیر لیا اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملانے لگے۔ ان میں سے ایک جرمنی سے نکالا ہوا فاشسٹ دشمن نوجوان تھا۔ جس کے چہرے کی لکیروں میں اس کی جھیلی ہوئی مصیبتوں کی کہانی لکھی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ اپنے دشمنوں کے خلاف محاذ بنانے کی خاطر ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم ہندوستانیوں سے کہیں کہ تم سامراج کے خلاف اپنی جدوجہد کو بند کر دو۔ یقین مانو کہ ہم ہندوستان کی تحریک آزادی کے پورے پورے ساتھی ہیں۔ ایک انگریز ترقی پسند نوجوان نے بھی آکر مجھ سے کہا کہ میری تقریر سن کر اُسے یقین ہو گیا تھا کہ فاشزم کے خلاف بین الاقوامی محاذ بنانے کے لئے سب سے زیادہ ضروری شرط یہی تھی کہ ہندوستان جیسے ملکوں کو جلد از جلد مکمل آزادی حاصل ہونی چاہئے تاکہ ان کے عوام فاشزم کے خلاف جنگ میں بھرپور حصہ لے سکیں ان دونوں کی باتوں کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور اس کے بعد گو رزولیوشن میں صرف اتنی ترمیم ہوئی کہ ہندوستان اور دیگر سامراجی مقبوضات میں فوری "ہوم آزادی کا نفاذ ہونا چاہئے۔ لیکن پھر بھی جو نوجوان شریک ہوئے تھے ان میں سے بیشتر نے اتنے جوش و خروش سے ہماری آزادی کی حمایت کی کہ اس کانفرنس کا نقش اب تک میرے دل پر تازہ ہے۔

وہ کانفرنس فاشزم اور جنگ کو روکنے کے لئے منعقد کی گئی تھی لیکن بہت دیر میں ہوئی۔ اس کانفرنس نے [illegible] میں فرانس اور انگلستان اس وقت پہنچا۔ جب برطانوی وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین ہٹلر سے چیکوسلواکیہ کا سودا کر رہے تھے اور ابھی سال بھی نہیں گزرا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔

میرے جیسے سب ہی ترقی پسند فاشسٹوں اور نازیوں کے مخالف تھے لیکن ہمارے اپنے ملک میں تو برطانوی سامراج ہمارے سر پر سوار تھا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہماری جنگ آزادی کا آخری دور شروع ہوا۔ اس زمانے کے دو واقعات نے مجھے از حد متاثر کیا۔

۸ راگست کو کانگریس نے برطانوی سرکار کو الٹی میٹم دے دیا۔ اسی رات کو سب لیڈر گرفتار کر لیے گئے۔ اگلے دن اعلان ہوا کہ شیواجی پارک میں عام جلسہ ہوگا جس میں کستوربا گاندھی تقریر کریں گی۔ وہ شام مجھے آج تک یاد ہے۔ پارک کا سارا میدان میدانِ جنگ کا نمونہ بنا ہوا تھا مگر یہ جنگ "اس جنگ سے کتنی مختلف تھی جو یورپ میں ہو رہی تھی۔ یہاں ایک طرف تک بھگ ایک لاکھ نہتے مرد، عورت، بچے۔ دوسری طرف ہزاروں مسلح پولیس والے اور ان کے افسران کے درجنوں انگریز اور اینگلو انڈین افسروں کے پاس ہر قسم کے ہتھیار، لاٹھیاں۔ بندوقیں، رائفلیں، ریوالور، لاریوں پر چڑھائی ہوئی مشین گنیں اور رلانے والی گیس کے بم، کئی گھنٹے تک "یہ جنگ" جاری رہی۔

لاٹھیاں برسائی گئیں، رائفلوں سے فائر کیے گئے، رلانے والی گیس کے سینکڑوں بم چھوڑے گئے، جن سے چاروں طرف زہریلے بادل چھا گئے۔ جن کے قریب آتے ہی بے اختیار آنکھوں میں مرچیں لگ کر آنسو بہنے لگتے تھے اور انسان تقریباً اندھا ہو جاتا تھا لیکن مجمع نے ہار نہیں مانی۔ اگر ایک جھنڈا بردار لاٹھی کھا کر گرا تو دوسرے نے ترنگا سنبھال لیا۔ اگر کوئی گولی کھا کر گرا تو والنٹیئر اسے فوراً اٹھا کر لے گئے۔ اور اس کی جگہ دوسروں نے لے لی۔ گیس کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی نے یہ نسخہ نکالا کہ رومال پانی میں بھگو کر چہرے کو ڈھانک لیا جائے تو گیس کا اثر نہیں ہوتا۔ پھر کیا تھا۔ چاروں طرف کی عمارتوں سے عورتیں بالٹیاں لے کر نکل پڑیں اور نہتے سورما ایک بار پھر پولیس اور فوج کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ جھنڈے لہرائے گئے۔ پولیس کے باوجود پارک کے کونے کونے میں جلسے ہوئے، آزادی کا ریزولیوشن بار بار پڑھا گیا۔ تقریریں ہوئیں۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے اور ایک لاکھ بمبئی نواسیوں نے اس شام عدم تشدد پر قائم رہتے ہوئے بھی سامراجی پولیس اور فوج کو شکست فاش دی۔

"جنگِ آزادی" یہ دو لفظ تو بچپن سے سنتا آیا تھا۔ سینکڑوں بار اپنی تقریروں اور مضامین میں بھی یہ لفظ دہرائے تھے۔ لیکن اس شام میں نے اپنی آنکھوں سے اس جنگِ آزادی کو دیکھا، اور اس میں شرکت کی۔ میری کمر پر بھی لاٹھی کی ایک ضرب لگی۔ زہریلی گیس کے اثر سے میں بھی وقتی طور پر اندھا ہو گیا اور جب لوگوں نے دیکھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے تو کوئی ان جانے ہاتھ مجھے سہارا دیتے ہوئے ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر لے گئے اور مرہٹی زبان میں نہ جانے کیا کہہ کر نہ جانے کس کے سپرد کر گئے۔ اس گھر کے کسی فرد نے میرا ہاتھ پکڑ کر پلنگ پر لٹا دیا اور میری آنکھوں پر پانی میں بھیگا ہوا رومال رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ آنکھوں کی چرمراہٹ کم ہو رہی ہے۔ رومال ہٹا کر میں نے دیکھنا چاہا تو پہلے تو ہر چیز دھندلی نظر آئی، جیسے گیلے شیشے میں سے دیکھ رہا ہوں لیکن جلد ہی آنکھوں کا فوکس ٹھیک ہو گیا، دیکھا کہ دیواروں پر بھگوان کرشن، شو بھاراج، دیوی لکشمی اور شیواجی کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ایک کونے میں پوجا کی جگہ ہے، جہاں مورتی رکھی ہوئی ہے۔ چراغ جل رہے ہیں، پھول رکھے ہیں اور ایک بوڑھی عورت پوجا کر رہی ہے۔

سولہ برس پہلے تو چھوت چھات کا کافی خیال رکھا جاتا تھا۔ میں اتنے مذہبی اور پوجا پاٹھ کے ماحول میں ہوں، یہ دیکھ کر میں کچھ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

پلنگ کی چوں چوں سن کر بڑی بی نے مڑ کر دیکھا، پھر مورتی کی طرف جلدی سے سر جھکا کر پوجا کو بیچ میں چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میرے پاس آکر مرہٹی میں بولیں: "کیوں اٹھ کیوں گیا، بیٹا۔ کچھ دیر اور آرام کر۔"

میں تھوڑی سی مرہٹی سمجھتا ہوں مگر بول نہیں سکتا، سو میں نے جواب ہندوستانی میں دیا۔ میں نے کہا: "نہیں اب میں

ٹھیک ہوں، رات ہوگئی ہے، اب مجھے جانا چاہیے"۔

"نہیں نہیں۔ پہلے دودھ پی لے۔" اور یہ کہہ کر وہ اندر گئیں اور ایک تانبے کے گلاس میں گرم گرم دودھ لے آئیں۔

میں نے سوچا اتنی مہربان دیوی کے دھرم کو کیوں بھرشٹ کروں، سو میں نے دودھ کا گلاس نہیں لیا اور کہا۔ "ماں جی میں مسلمان ہوں"۔ ـــــ

میرا خیال تھا کہ یہ سُن کر وہ سوچ میں ضرور پڑ جائیں گی کہ اب اس ملیچھ سے کیسے برتاؤ کیا جائے مگر انھوں نے ایک سکنڈ بھی توقف نہیں کیا اور بولیں۔ "تو پھر کیا ہوا؟" اور یہ کہہ کر مجھے دودھ کا گلاس پکڑا ہی دیا۔

میں نے دودھ کا ایک گھونٹ پی کر کہا۔ "شما کرنا ماں جی۔ میری وجہ سے آپ کی پوجا پوری نہ ہو سکی"۔

اُس بوڑھی۔ گمنام، شاید اَن پڑھ مرہٹہ خاتون کا جواب سُن کر میں ششدر رہ گیا۔ بولیں۔ "تو کیا ہوا بیٹا۔ یہ بھی تو پوجا ہی ہے"۔

اور اُس وقت میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں گاندھی جی کی تصویر بھی لگی ہوئی ہے اور اس تصویر میں وہ مسکرا رہے ہیں اور ان کی مسکراہٹ مجھ سے کہہ رہی ہے۔

"دیکھا تم نے۔ انقلاب یوں بھی آتا ہے دھیرے دھیرے دل کے راستے"۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء۔ آزادی کا پہلا دن۔ کسی قوم کی زندگی میں یہ دن ایک ہی بار آتا ہے اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ دن ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آزادی کے اس جشن میں شرکت کی۔ اس "واقعہ" سے متاثر ہوئے بغیر بھلا کون رہ سکتا تھا۔ بمبئی میں گوالیا ٹینک کے میدان سے وہ یادگار جلوس چلا جو ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہی تھا۔ میری یاد میں پہلی بار اور (فی الحال) آخری بار تمام سیاسی پارٹیوں اور تمام فرقوں اور جاتیوں اور ہر پیشے کے لوگوں نے مل کر ایک قومی تہوار منایا۔ کانگریسی۔ سوشلسٹ، کیمونسٹ، ہندو مہا سبھائی، جن سنگھی، مسلم لیگی اس مذہب ہر مسلک کے پیرو ایک ہی رُخ، ایک ہی راستے پر دوش بدوش چل رہے تھے۔ ادیب، کالجوں کے پروفیسر، طالب علم، مل مزدور، کلرک چپراسی، تاجر، سیٹھ اور بھنگی اور جوتا پالش کرنے والے چھوکرے اور مشہور فلم اسٹار اور بین الاقوامی شہرت کی ناچنے والیاں اور چھوٹے موٹے دوکاندار اور ہوٹلوں کے بیرے اور باورچی اور بھکاری اور فقیر اور لکھ پتی اور سرکاری افسر اور بے کار ـــــ وہ جلوس نہیں تھا ساری ہندوستانی قوم تھی جو سڑکوں پر اُمڈ آئی تھی اور آزادی کی خوشی میں نعرے لگا رہی تھی، گا رہی تھی، ناچ رہی تھی۔ ایک سنجیدہ اور مقبول فلم ایکٹر ڈھول بجا رہا تھا اور اسی کی لے پر ایک پڑھی لکھی کھاتے پیتے خاندان کی لڑکی جو لندن اور پیرس اور نیویارک کی اسٹیج پر ناچ آئی تھی ناچ رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ایک کالا سا دُبلا سا مزدور ناچ رہا تھا اور ایک ادیب اور جرنلسٹ نہایت بھونڈے اور بھدے طریقے سے ان دونوں کے ساتھ ناچنے کی بالکل ناکام کوشش کر رہا تھا اور وہ ادیب و جرنلسٹ میں تھا۔ نہ جانے اس دن مجھے کیا ہو گیا تھا؟ نہ جانے ہم سب کو، لاکھوں کروڑوں ہندوستانیوں کو اس دن کیا ہو گیا تھا؟ نہ جانے پھر ہم سب کے سر پر وہی جنون کب اور کیسے سوار ہوگا۔؟

ابھی پندرہ اگست کے نعرے فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ شمال مغرب اور شمال مشرق سے فرقہ وارانہ قتل و خون کی خبریں آنے لگیں۔ بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ گئی۔ نتیجتہً راہ چلنے والوں پر قاتلانہ حملے ہونے لگے۔ اس ہولناک زمانے کے کئی واقعات نے مجھے از حد متاثر کیا اور ان میں سے اکثر کے بارے میں اپنے مضامین اور افسانوں میں لکھ چکا ہوں۔ مگر ایک واقعہ ایسا ہے جس کا میں نے ابتک

کسی سے ذکر نہیں کیا۔

شیواجی پارک کے علاقے میں جو چند مسلمان خاندان رہتے تھے وہ سب اپنے اپنے گھر چھوڑ کر "محفوظ مسلم علاقوں" میں چلے گئے صرف میں اور میری بیوی اپنی سمندر کے کنارے والی فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔

چند فرقہ پرور سنگھی سورماؤں نے کوشش کی کہ ڈرا دھمکا کر ہمیں بھی مجبور کیا جائے کہ یہ علاقہ چھوڑ دیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ اگر شیواجی پارک میں میرے لئے زندہ رہنا ناممکن ہے تو زندہ رہنا ہی بیکار ہے۔ میں وہیں رہا۔ ایک شام کو اندھیرا ہونے کے بعد دادر اسٹیشن پر ریل سے اترا تو دیکھا بازار سب اندھیرے اور سنسان ہیں۔ معلوم ہوا کہ قتل کی چند واردات ہو چکی ہیں، اس لئے کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے اور نو بجے کے بعد کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس وقت تقریباً پونے نو بجے تھے۔ میں نے جلدی جلدی قدم بڑھائے کہ کرفیو کے وقت سے پہلے اپنے گھر پہنچ جاؤں۔

راستے میں دادر کی ایک اندھیری سی گلی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی پیچھے چلا آرہا ہے۔ میں فطرتاً کوئی بہت بہادر نہیں ہوں، اگر میں اس خطرناک زمانے اور اس خطرناک علاقے میں اندھیرے اجالے اس طرح اکیلا گھومتا تھا تو اس میں بہادری سے زیادہ ضد کو دخل تھا۔ میں نے سوچا آج ضرور میری موت آگئی مگر اب تو بھاگنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ وہ شخص جو بھی تھا مجھ سے چند قدم پیچھے ہی چلا آرہا تھا۔ مرنا ہے تو پیٹھ میں چھرا کھا کر کیوں مروں۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے قدم دھیمے کر دیئے اور جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے بالکل قریب آگیا ہے تو میں ایک دم ٹھہر کر مڑا۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ بیچارہ ڈر کر ٹھٹک گیا کہ شاید میں اس پر حملہ کرنے والا ہوں۔

اس کو اطمینان دلانے کے لئے میں نے پوچھا۔ "کیوں کرفیو لگا ہے کیا؟"

اس نے کہا: "ہاں نو بجے کا کرفیو ہے ادھر۔ مگر شیواجی پارک میں نہیں ہے۔"

اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے۔

"کیوں بھئی تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"شیواجی پارک، اور تم؟"

"میں بھی شیواجی پارک۔"

"وہاں رہتے ہو کیا؟"

"ہاں۔"

"کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمہارا؟"

میں اس سوال کا انتظار ہی کر رہا تھا اور اس سوال سے ڈر بھی رہا تھا۔ اب کیا جواب دوں؟ کہوں کہ میرا نام گوپال راؤ ہے یا موہن لال ہے یا وسنت ڈیسائی ہے اور اگر اس نے جرح شروع کر دی اور بھانڈا پھوٹ گیا تو؟ یا یہ کہوں کہ تم کون ہوتے ہو میرا نام پوچھنے والے۔ اس سے تو اسے شبہ کیا یقین ہو جائے گا کہ میں اپنا نام چھپا رہا ہوں۔

سو میں نے کہا: "میرا نام ہے احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس۔"

اس نے کہا: "تم پیپر میں کام کرتے ہو نا؟"

میں نے کہا: "ہاں بمبئی کرانیکل میں۔"

"اور تم ابھی تک شیواجی پارک میں رہتے ہو؟"

میں نے کہا: "ہاں کئی برس سے یہیں رہتے ہیں ہم۔"

اور اتنے میں ہم پولس کے سپاہیوں کے ایک گروہ کے قریب سے گزر کر کرفیو کی حدود سے گزر کر شیواجی پارک والی سڑک پر آ گئے۔

میرے ہمراہی نے کہا: "میٹنگ میں چل رہے ہو، عباس بھائی؟"

میں نے کہا: "کون سی میٹنگ؟"

"سورکشا دل بنا رہے ہیں نا۔ سب شیواجی پارک کے رہنے والے اکٹھے ہوں گے۔"

میں نے کہا: "تو ضرور چلتا ہوں۔"

سو ہم دونوں اکٹھے اس جلسے میں داخل ہوئے۔ سوا سو آدمی موجود تھے اور ان میں سے اکثر مجھے جانتے تھے۔ "آؤ آؤ، عباس بھائی۔" چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

تجویز پیش کی گئی کہ فسادات کی روک تھام کے لئے اور شیواجی پارک کے علاقے میں امن قائم رکھنے کے لئے ایک "سورکشا دل" (خود حفاظتی دستہ) بنایا جائے۔ کمیٹی کے ممبروں کا چناؤ ہوا۔ پہلا ممبر جس کو چنا گیا اس کا نام تھا "خواجہ احمد عباس"۔

اور جن لوگوں نے میرے نام کی موافقت میں ہاتھ اٹھائے ان میں وہ آدمی بھی تھا جس کو چند منٹ پہلے میں اپنا قاتل سمجھ رہا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد اس سے ضرور ملوں گا۔ اس کا نام پوچھوں گا۔ لیکن جلسے کے ختم پر جو بات چیت اور بحث و مباحثہ اور افراتفری ہوتی ہے۔ اس میں وہ کھو گیا اور آج تک مجھے اس کا نام نہیں معلوم ...!

گو اس کے بعد میں بدترین فسادات کے دوران میں بمبئی کے ہر علاقے میں گھوما، دلی اور پانی پت گیا، کشمیر گیا۔ جب سارا ہندستان اور پاکستان نفرت اور غصے اور انتقام کے خونی سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن جہاں کہیں بھی میں گیا خود میں نے تو غیر معمولی انسان ہی دیکھے۔ ہندو، سکھ، مسلمان۔ نہ مجھے کسی سے خوف ہوا، نہ کسی نے مجھ پر حملہ کیا اور مجھے ایسا لگا کہ دراصل یہ فسادات، یہ خون خرابہ، یہ دنگے، یہ مار دھاڑ اس وقت ہوتی ہے جب تعصب اور نفرت کا اندھیرا چھایا ہوتا ہے اور اس اندھیرے میں ہر راستہ چلتا ایک خونی اور ڈاکو نظر آتا ہے اور ایک دوسرے کا خوف ایک دوسرے پر حملہ کراتا ہے، ایک دوسرے کا خون کراتا ہے۔

اور اپنی یادداشت کے اندھیرے میں اب بھی میں اس گمنام انجانے ہمراہی کے قدموں کی آواز سنتا ہوں اور جب میں مڑتا ہوں اور ہم آمنے سامنے ہوتے ہیں تو اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

اور میں بے خوفی اور کسی قدر فخر سے جواب دیتا ہوں: "احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس۔ جو چوالیس برس ہوئے پانی پت میں پیدا

ہوا تھا۔ پانی پت جو اب بھی ہندوستان میں ہے اور میرے نانا تھے خواجہ سجاد حسین جنھوں نے بچوں کی تعلیم کے لئے اپنی ساری دولت، ساری عمر اور ساری طاقت خرچ کردی اور میرے والد تھے خواجہ غلام السبطین جنھوں نے مجھے سچ بولنا سکھایا کسی کے سامنے سر نہ جھکانا سکھایا اور سیاسی اختلافات میں رواداری سکھائی اور میری والدہ تھیں مسرورۃ النسا بیگم جنھوں نے اسکول کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی نہ کسی سیاسی جلسے میں شریک ہوئی تھیں لیکن جو آخری دم تک اپنے ملک ہندوستان کی وفادار رہیں...... مگر میں اپنے خون کے رشتے داروں ہی کی اولاد نہیں ہوں۔ میں اپنے ملک اور قوم کی اولاد بھی ہوں۔ گاندھی اور نہرو کے خاندان میں سے ہوں اور انسانیت اور سوشلزم کے ناطے سے میرے رشتے دار ساری دنیا میں —— روس میں اور امریکہ میں، انگلستان میں اور چین میں —— پھیلے ہوئے ہیں اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ مجھ پر (اور ہر شخص پر) اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ جیسا ایک یوروپین شاعر جان ڈان JOHN DONNE نے کہا ہے:

"کوئی انسان جزیرہ نہیں ہے۔
ہر انسان سمندر میں ایک قطرہ ہے۔
ہر انسان زمین کا ایک ذرہ ہے۔
ہر انسان کی موت میری موت ہے کیونکہ میں اور انسانیت جدا نہیں ہیں۔"

.... اور اسی طرح دن، مہینے اور برس گزرتے ہیں اور شخصیات اور واقعات کا لامتناہی جلوس گزرتا رہتا ہے اور جس طرح کیمرے کی فلم پر ہر منظر کا عکس (خواہ وہ صاف ہو یا دھندلا) پڑنا ضروری ہے اسی طرح ان واقعات اور شخصیات کا اثر قبول کرنا بھی میرے لئے (اور ہر کسی کے لئے) لازمی ہے۔ یہ سلسلہ ہر انسان کی پیدائش کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور موت سے پہلے یہ ختم نہیں ہو سکتا۔

جلد ۴ شمارہ ۷ ستمبر ۱۹۷۸ء
اشاعت: مارچ ۱۹۸۰ء
شخصیت و فن
جلد اوّل
آپ بیتی نمبر
۲
مدیر:
صابر دت
معاون مدیر:
کلیم راہی
موجودہ شمارہ
۵۰ روپے
عام شمارہ
۱۰ روپے
SOLE DISTRIBUTORS
SĀKĀR PUBLISHERS PVT., LTD.
107-JOLLY BHAVAN NO. 1,
10 NEW MARINE LINES,
BOMBAY-400 020.

آپ بیتی نمبر
نگراں
کالیداس گپتا رضا
مدیر
صابر دت